

# اسلام پاکستان میں

۲

پروفیسر شیخ محمد عثمان

اس سے قبل اس مضمون کی جو قسط فتووری ۷۴ء کے "فکر و نظر" میں شامل ہوئی ہے، اس کے پہلے حصے میں میں نے اپنی آبادی کے مختلف طبقوں کا اسلام سے والستگی یا عدم والستگی کے لحاظ سے تجزیہ کیا ہے اور دوسرے حصے میں سید ابوالاعلیٰ مودودی، خلیفہ عبد الحکیم رحموم اور حناب علام احمد پرویز کے مذہبی انتکار اور دینی سرگرمیوں کا جائزہ لیا ہے۔ پیش نظر حصہ میں میں یہ بناۓ گی کوشش ٹراؤں گا کہ میرے نزدیک وہ ٹراؤں سے امور ہیں جن میں ہماری مناسب توجہ اور خلوص عمل پاکستان میں اسلام کے مستقبل کو مستحکم بنا سکتے ہیں:

۱

## معاشی عدل کا قیام

بغیر تمہید کے پہلی بات تو میں یہ عرض کروں گا کہ اس مک (اور شامدسب اسلامی ملکوں) میں اسلام کی آئندہ کامیابی کا سب سے زیادہ احتمال اس امر پر ہے کہ ہم مسلمان اپنے معاشرے کی موجودہ معاشی خرابیوں اور شدید ناہمواریوں کو دور کر کے اس کی جگہ روحِ اسلام سے موافقت رکھنے والا معاشی نظام قائم کریں۔ مجھے لیتی ہے کہ دنیا کے مخلص اور دانہ مسلمانوں کا اس سوال پر اختلاف رائے نہیں ہو سکتا کہ معاشی معاملات میں اسلام کی تعلیم اور اس کا نقطہ نظر کیا ہے؟ آرچ کوئی معاشرہ نسل انسانی کے مجموعی شعور سے کٹ کر یا تاریخ کی قوتوں کے خلاف صفت آرا

بُوکر زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ اب اصل سوال انشتہ اکی یا غیر انشتہ اکی اور سامراج یا مزدور راج کا ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ نسل انسانی کا معاشی شعور ایک ایسے نقطے پر پہنچ چکا ہے، جہاں معاشی ناہمواریوں کا استرار ممکن نہیں۔ تاریخ کی توتیں مہلت تو دے سکتی ہیں، کھلی چھپی عطا نہیں کرتیں۔ جدید معاشی شعور کا سورج جب سے طلوع ہوا ہے، بے شمار قوموں نے یا تو الفلاح اور جبر کے ذریعے یا ترقی کی ترقی اور ارتعانی قانون سازی کی مدد سے اپنے عوام کے افلas اور محرومی کا علاج کر لیا ہے۔ امریکی، انگلستان اور مغربی یورپ کو ایک طرف اور روس، مشرقی یورپ اور چین کو دوسری طرف رکھ کر دیکھتے تو معلوم ہو گا کہ اسلامی ملکوں کا معاشی بندوبست، مغرب سے بھی پہنچپے ہے اور مشرق سے بھی۔ حالانکہ عدل و انصاف کا قیام اور شدید تفاوتوں کا انداد اسلامی تعلیمات کا پہلا معاشرتی تقاضا ہے۔

ہر دور میں کچھ مسائل اور کچھ معیار لاطور خاص ابھرتے ہیں، اور زندگی کے ناپ توں کا پہیا نہ بن جاتے ہیں۔ معاشی انصاف آج کے دور کا پہیا نہ ہے۔ جو معاشرہ، جو مذہب اور جو نظام فکر و سیاست اس پہیا نے پر پوڑا ہے اُترتا، ناقص اور فرسودہ قرار پاتا ہے۔ لہذا اسلام کی بقا اور فروغ و استحکام کا راز اس امر میں مضر ہے کہ ہم اسلام کے نام لیوانہ صرف اپنے معاشرہ کی شدید ناہمواریوں اور تفاوتوں کو دُور کریں بلکہ ان تفاوتوں کو دُور کرنے کے تمام عمل کا رشتہ واضح اور غیر مبهم طور پر اسلام سے قائم و برقرار رکھیں۔ معاشی تفاویں آج ہنیں تو کل تاریخ کی تفتوں کے ہاتھوں بھی مٹ جائیں گی۔ لیکن اس سرزی میں میں اسلام کا سہلا اور اس کی بہترین خدمت یہ ہے کہ یہ ناگزیر اور اطلیل معاشرتی تبدیلی اسلام کے ذریعے اور اسلام کے نام پر عمل میں آتے، بصیرت دیکھ کر اس بات کا اندیشہ ہے کہ ہمارا نیا معاشرہ اور اسلام ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ بن جائیں!

## ۲

### عورت کے بارے میں اعتدال پسندی

عورت کے بارے میں ہمارا روایہ اور لفظ نظر گر شستہ ایک سوبہ سے سلسلہ نتیجی کے عمل سے گزر رہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں بھی ہمارے شعور اور منصیلے کا داخل کم ہے اور وقت کی تفتوں کا زیادہ۔ بعض صورتوں میں تلویوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود سوچنے اور طے کرنے کی بجائے اپنے آپ کو زمانے کی لہروں کے سپرد کر دینے کو زیادہ محفوظ اور نتیجہ نیز طرزِ عمل سمجھتے ہیں۔ بلاشبہ یہ طریقہ کارکسی مہذبِ قوم کے

شایان شان نہیں۔

ہماری آنکھوں کے دیکھنے کی بات ہے کہ مسلمانوں کے اچھے اچھے گھرانے عورتوں کی تعلیم کے شدید مخالف تھے۔ یہ صیغہ میں انیسویں صدی کے وسط میں ہزاروں علماء یہ فتویٰ دینے کے لئے تیار تھے کہ پچیوں کو اسکو لوں میں بھیجا دین و دنیا کی تباہی مول لینا ہے۔ پھر یہ تعصّب اسکوں کی تعلیم کے خلاف کم ہوتا گیا لیکن خواتین کی پیشی و راستہ تربیت کے خلاف یہ صورت حال بدستور باقی رہتی۔ بے شمار والدین یہ لقصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بیٹی طاکڑ، نرس، وکیل یا نجی بن سکتی ہے۔ پھر خواتین کا سیاسیات میں حصہ لینے کا سوال اٹھا اور پہلے محاذوں پر ہارنے والوں نے مدافعت کی آخری صفت کے طور پر یہاں مورچے سنبھال لئے۔ لیکن گزشتہ صدارتی انتخابات میں یہ مورچے بھی سر ہو گیا۔ اب تعلیم و تربیت اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں خواتین کی شرکت کے متعلق ہمارے نقطہ نظر میں خاصی معقولیت اور اعتدال پسندی آچکی ہے۔

لیکن جاننے کے قابل بات یہ ہے کہ اسلام جہاں خواتین کی تعلیم و تربیت اور قومی زندگی میں ان کی شرکت کے خلاف کوئی انتہا پسندانہ قدر عنہیں لگاتا اور معاشرے کے اس لصفت پر فکر و عمل کے دروازے بند نہیں کرتا، وہاں اخلاقی پاکیزگی اور حبیسی حیا و حجاب اس کے نظام معاشرت کی روح ہے۔ اسلام یہ نہیں کہا کہ پچیوں کو کھنپاڑہ نہامت سکھاؤ۔ وہ عورتوں کو کسی سہر کی تربیت دینے سے جو ان کا ذریعہ معاش بن سکے، منع نہیں کرتا۔ وہ ان کے جائز طرقوں سے کمانے اور اپنے کام کا ج کے لئے گھروں سے باہر نکلنے پر بھی کوئی پابندی نہیں رکھتا لیکن مغربی معاشرت میں عورت کی 'آزادی' سے جو مفہوم لیا جا رہا ہے، اسلام لقیناً اس کی تائید نہیں کر سکتا۔ جنسی یہ راہ روی اور یہ حیاتی اسلامی معاشرت کی صدر ہے۔

اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہمیں دونوں فتم کی انتہا پسندی سے بچنا چاہیے۔ خواتین کی تعلیم، تربیت، حصول معاش اور قومی زندگی میں ان کی یلا روک ٹوک شرکت کے حقوق اصولاً ہم پاکستانیوں نے تعلیم کر لئے ہیں اور ان اصولی باتوں کے خلاف اگر بعض صورتوں میں کچھ ذہنی تحفظ یا تعصّب پایا جاتا ہے تو وہ بھی رفتہ رفتہ دور ہوتا جا رہا ہے لیکن یہ مسئلہ کا صرف ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ملک کی خواتین کا ایک طبقہ، اگرچہ یہ طبقہ بھی بہت ہی محضسر سا ہے، ان جددوں کو بھلا نگئے کی کوشش کر رہا ہے جو بے جا جنسی احتلاط، نمائش زینت اور معاشرتی بے راہ روی کے خلاف اسلام نے مقرر کی ہیں۔

پاکستان میں جو لوگ اسلام سے سچی محبت اور اس کے فروع و استحکام میں حقیقی دل چسپی رکھتے ہیں،

ان کا فرض ہے کہ وہ اس مسئلے میں اعتدال کی راہ پر سختی سے قائم رہیں تاکہ ملک میں رائے عامہ کی ایک الیسی موثر نصاقاً قائم ہو سکے جو نہ تو عورت کے ساتھ کسی ناصافی اور حق تلقی کو برداشت کرے اور نہ اس بے راہ روی کی تاب بحثی ہو جسے خواتین کا کوئی طبقہ آزادی کے نام پر اختیار کرتے اور مقبول بنانے کی گوشنچ کرے۔

(۳)

### تعلیم کی اسلام سے ہم آہنگی

اپنے نظامِ معيشت کو اسلام کی معاشری ہدایات کے مطابق ڈھالنے اور مسلمان عورت کے بارے میں اعتدال پسند اور رویہ اختیار کرنے کے بعد تیری چیز جو میرے نزدیک ہماری فوری توجیہ کی محتاج ہے، نظامِ تعلیم میں الیسی تبدیلیاں ہیں، جو اسے اسلامی ثقافت اور اسلامی تعلیمات کی روح سے ہم آہنگ کرنے یہ معاملہ جذباتی طور پر تو ہم گذشتہ بیس یرس سے حل کر رہے ہیں اور ملک کا کوئی قابل ذکر دانشور یا حاکم ایسا نہ ہوگا جس نے کسی نہ کسی وقت یہ لغڑہ بلند نہ کیا ہو کہ ہماری تعلیم کو اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا چاہیئے لیکن یہ کیسے ہو اور تعلیم کے اسلامی اصولوں کے مطابق ہونے کے حقیقتاً معنی کیا ہیں، اس پر شاذ و تاریخی عنوف زیادگیا ہے۔ میرے خیال میں موجودہ زمانے میں کسی ملک کے نظامِ تعلیم کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ کرنے کا کام اتنا ہی مشکل اور ناک ہے جتنا کسی ملک کے لئے اسلامی آئین کا تیار کرنا۔ اور ہمارے اکثر ذات و رون کو معلوم ہے کہ اسلامی آئین کی ترتیب و تیاری میں ہم نے کیا کیا اور کہاں کہاں مٹھو کریں کھائیں اور کسی کسی کھانا یوں کا ہمیں سامنارہا ہے۔

تاہم دو باقی میں اس ضمن میں ایک گونہ تلقین کے ساتھ کہ سکتا ہوں اول یہ کہ بعض مضامین ایسے ہیں جن کی تدریس معمولی رد و بدل کے ساتھ تمام دنیا میں یکساں ہے۔ فذک، کمیسری، باطنی، زواں لوچی، جغرافیہ، ارضیات، فلکیات، ریاضی اور اسی طرح طب اور اخنیزیریگ، یہ ایسے سائنسی علوم ہیں کہ محتواڑی سی کی بیشی کے ساتھ روس میں بھی ویسے ہی پڑھائے جاتے ہیں جیسے مثلاً انگلستان میں یا امریکہ میں ان کی تدریس قریب قریب ولی ہی ہے جیسی چین یا مشرقی یورپ میں۔ لہذا یہ علوم پاکستان میں بھی اسی طرح پڑھائے جائیں گے جیسے بھارت سمیت دوسرے ملکوں میں۔ ان مضامین کے طبقہ تدریس میں ہم محتواڑا بہت مقامی زنگ پیدا کر سکتے ہیں۔ تاہم بجیشیت مجموعی ان مضامین کا موارد اور تدریس اپنی میان القوامیت قائم رکھئے گی اور ہمارے لئے اس کے سوا کوئی جارہ کا رہنہ کہ اس میدان میں ہم ترقی یافتہ ملکوں کے

قدم بر قدم چلتے کی کوشش کریں۔

فلسفہ، نفیات، سیاست اور معاشیات ایسے مصنایں ہیں کہ بعض نظر باتی مملکتوں میں ان کی تدریس دوسرے ملکوں سے کچھ مختلف ہو سکتی ہے مگر جہاں تک ہماری علمی تحقیقات اور ہماری موجودہ طرزِ معاشرت کا تعلق ہے، ان مصنایں کی تدریس میں بھی ہم کوئی خاص امتیازی رنگ یا الفرادیت پیدا نہیں کر سکتے۔ مثال کے طور پر ہم اپنے ہاں بی۔ اے یا ایک اے میں نفیات یا معاشیات کے نصاب کو اس نصاب سے جو ان مصنایں کے انہی درجوں میں مثلاً بھارت میں رائج ہے، کچھ زیادہ مختلف یا بہتر نہیں بن سکتے۔

البتہ تین مصنایں میرے نزدیک ایسے ہیں جن کو ہم اپنی صوریات اور قومی امکنوں کے مطابق، باقی ساری دنیا کے طرزِ تدریس یا فقط نظر سے بے تعلق اور بے نیاز ہو کر جس طرح چاہیں پڑھا سکتے ہیں اور یہی وہ میدان ہے جس میں مناسب اقدامات سے ہم اپنی اس آرزو کی تکمیل کر سکتے ہیں جس کا لغزہ لگاتے لگاتے ہمارے حلقوں خشک ہو گئے ہیں۔ میری مراد یہاں اردو (اور بولگھر) تاریخ اور اسلامیات سے ہے۔ زبان کی تدریس اور بالخصوص قومی زبان کی تدریس میں تین پہلو ملحوظ رکھے جا سکتے ہیں۔ اول، زبان کا پہلو، دو م ادب کا پہلو اور سوم اس ثقافت اور تہذیب کا پہلو جو کسی زبان کے ادب عالیہ کی روح میں کارفرما ہوتی ہے۔ ہماری بد قسمتی یہ ہے کہ گزشتہ بیس برس میں ہم نے زبان کی تدریس کے ان پہلوؤں کو نہ واضح طور پر جانا اور نہ کسی معقول منصوبے کے تحت ان سے کام لیا۔ ثقافت کا پہلو تو خبر سرے ہی سے نظرؤں سے اوچھی رہا۔ آپ اردو کے نصاب کو پہلی جماعت سے لے کر ایم۔ اے تک دیکھ ڈالئے۔ اپنے ثقافتی ورثے کو نئی نسل تک بہنچانے اور موثر طور سے منتقل کرنے کا مقصد اور شعور آپ کو کہیں کا پرمادھانی نہ دے گا۔ حالانکہ زبان کی تدریس کی افضل ترین غایت اور سطح یہی ہوتی ہے اور دنیا بھر کے ترقی یافتہ ملک اپنی اپنی قومی زبان کی تدریس میں یہی غایت پیش نظر رکھتے ہیں۔

باقی رہے زبان اور ادب کے پہلو۔ سوان کا حشر بھی ایک المیہ سے کم نہیں۔ بے مقصدی اور کم شعوری کے باعث ان پہلوؤں میں کسی ترتیب اور ترتیج کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ آپ کو حصی یا سالتوںیں جماعت میں ایسے ادب پارے مل جائیں گے جو الیت۔ اے یا۔ اے میں پڑھائے جانے چاہیں اور الیت۔ اے اور بی اے میں ایسے مختبات پائے جاتے ہیں جو مڈل یا زیادہ سے زیادہ ملٹریک کے نصاب میں جگہ پانے کے قابل ہوں۔ بعض درجوں میں نصاب بے پرواٹی اور بے والشی کا افسوس ناک مظہر ہے۔ اس کی ایک حیرتی مثال

یہ ہے کہ پچھلے پنٹیس چالیس سال سے بی اے کے اختیاری اردو کے اخاب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سواتے اس کے کہ یہ پرچہ پہلے چاپس نمبر کا ہوتا تھا اور اب ایک سو نمبر کا ہے۔ میرے زمانہ طالب علم (۱۹۳۰-۱۹۴۲)

میں بھی استاد جماعت میں دیوانِ غالب کی آخری ردیف پڑھاتے تھے اور میرے اساتذہ کا بیان ہے کہ بی اے میں خود انہوں نے بھی یہی ردیف پڑھی تھی اور اب بھی طبیاء دیوانِ غالب کی وہی ردیف پڑھتے ہیں۔ قریب

قریب یہی حال دوسرے درجوں کا ہے۔

یہ فیصلہ کرنا یہ اشکل ہے کہ طالب علموں کی ذہنی تربیت اور جذباتی پر راحت میں قومی زبان و ادب کا حصہ زیادہ ہوتا ہے کہ قومی تاریخ کا۔ دراصل دونوں مضامین اگر مناسب اور درست طور سے پڑھائے جائیں تو طالب علموں کے ول و دماغ پر نہایت گہرے اور فیصلہ کن اثرات پیدا کر سکتے ہیں۔ ادب حال اور مستقبل کے مسائل میں نظر ہم پہنچاتا ہے اور طالب علم کی شخصیت کی تعمیر ایک بلند انسانی سطح پر کرتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ماضی کے مسائل میں فہم اور بصیرت بخشتا ہے اور طالب علم کو نہ صرف اس کی ذات کا ایک پختہ اور سچا شعور، قومی سرگزشت کے حوالے سے دیتا ہے بلکہ اس کے مستقبل کے منصوبوں میں اس کی صحیح رہنمائی اور مدد کرتا ہے۔

لیکن افسوس کی بات ہے کہ سوائے استثنائی صورتوں کے (جو تعلیم کے بغیر بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں) ہمارے ہاں نہ قومی ادب سے اور نہ قومی تاریخ کے مطالعہ سے ان مقاصد کے حصول میں کچھ مدد لی جا رہی ہے۔ تاریخ کی تدریس غالباً قومی زبان کی تدریس سے بھی زیادہ ناقص، بے مقصد اور غیر منسوب ہے۔

اسلامیات کی حالت اردو اور تاریخ سے بہتر نہیں ہے۔ یہاں بھی جس درجے میں جن موضوعات کو جیسی زبان میں پڑھانے کی صورت ہے، ہم اس کے شعور سے عاری ٹری حد تک جذبات کا سوا انگ رچانے میں مصروف ہیں۔

یہ موقع نہیں کہ میں اردو، تاریخ اور اسلامیات کی موجودہ تدریس کے نقصان پر تفصیل بیان کروں اور ان صوریات کا خاکہ پیش کروں جن کو ملحوظ رکھے بغیر ہم ان مضامین کی تدریس سے اپنی تی نسل کی صحیح ذہنی اور روحانی تربیت کرنے کے فرض سے عمدہ برآئیں ہو سکتے۔ یہاں اتنا کہنا کافی ہونا چاہیے کہ سب تدریسی مضامین میں یہ تین مضامین تربیت کے خاص مضامین ہیں اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے نظام تعلیم میں اسلامی قدرتوں کی ترویج ہو اور ہماری نئی نسل اپنی ثقافت سے محبت کرنا سیکھے اور صحیح خطوط

پر اس کی ترقی میں ہمارا ہاتھ بٹائے تو ہمیں ان مصنایفین کی تدریسیں کو بہترین درسی معیار پر لانے کی طرف فوری توجہ دینی چاہیے۔ اور ان کو ان کی موجودہ پست اور یہ نتیجہ تدریسی سطح سے نکالنے کا جتن کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں دو تجاویزیں اور پیش کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان یا صوبائی حکومت کو چاہئے کہ ملک کے تین چار ایسے افراد انتخاب کر کے جن کا تعلیم میں معقول تجربہ ہو، لیکن جنہوں نے صرف تعلیم پر غیر ملکی مصنیفین ہی کی کتابیں نہ پڑھی ہوں بلکہ اپنے ہاں کے تعلیمی مسائل پر خود ہی عنرو فنگر کیا ہو (اور اس عنرو فنگر کا ثبوت بھم پہنچایا ہو) انہیں تدریس کے بعد یہ ترین رجحانات مطالعہ کرنے اور ان پر مپورٹ مرتب کرنے پر مامور کرے۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہمارے یہ ماہرین تعلیم ایک طرف تو ترقی یافتہ غیر اشتراکی ممالک میں سے بعض مثلاً امریکہ، انگلستان یا مغربی جمیں اور دوسری طرف روس، مشرقی یورپ اور چین کا دورہ کر کے دونوں طرح کے ممالک میں سے چند کے مروجہ نظام ہائے تعلیم کا بغور و طالع کریں اور درس و تدریس کے میدان میں جو اقلاب، خصوصاً چین میں آیا یا لایا گیا ہے، اس کا بچشم خود مشاہدہ کر کے ہمیں تباہی کریے تو میں اپنی اپنی نئی نسل کو اپنے اپنے قومی مقاصد سے وابستہ رکھتے اور ان کے ذہن و کردار کو اپنی اپنی قومی آرزوں کے مطابق استوار کرنے کے کیا جدید وسائل و ذرائع اختیار کئے ہوئے ہیں اور ہم اہل پاکستان کو اپنی نئی نسل کی اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر کس طرح تربیت کرنی چاہیئے اور اپنے نظام تعلیم میں کیا کیا تبدیلیاں لانی چاہیں جن کی بدولت ہم کو کبھی اپنے مقاصد میں وہ کامیابی حاصل ہو جو مثلاً امریکہ، روس یا چین کو ان کے مقاصد میں نصیب ہے

دوسری تجویز یہ ہے کہ جب ہم اپنے طور پر یہ کام کر لیں تو آر۔ سی۔ ڈی کے تحت یعنی ترکی اور ایران را اور دوسرے آنارہ تعاون اسلامی ملکوں سے مل کر ایک تعلیمی کمیشن ترتیب دیں جو اس اہم سوال کا جائزہ لے کے جدید زمانے میں نظام تعلیم کو اسلام کی روح سے ہم آہنگ کرنے کے کیا معانی ہیں۔ اور اس غرض سے ہم کو کیا کیا طریقے اور وسیلے اختیار کرنے چاہیں۔

(۳)

### غیر اسلامی ثقافتوں کی طرف ہستارا رویہ

ہماری بہت سی مشکلوں اور الجھنوں کا ایک باعث یہ ہے کہ ہم مسلمان بحیثیت مجموعی اس بات کا کوئی واضح شعور نہیں رکھتے کہ دنیا بھر کی دوسری تہذیبوں اور قوموں کی طرف ہمارا رویہ ٹھیک ٹھیک

کیا ہونا چاہیے اور اس رویت سے متین کرنے میں کن اصولوں اور ضابطوں کی پابندی ہم پر لازم ہے۔ صدیوں سے عام مسلمانوں اور مولوی حضرات، کاظرِ عمل کچھ یہ رہا ہے کہ تمام عزیز اسلامی دنیا کے خلاف مستقلًا اعلان جنگ کئے رہو اور جو قوم مسلمان نہیں اور جو تفاوت اسلامی نہیں اس سے جہاد جاری رکھو۔ یہ طرزِ عمل بظاہر جس قدر اسلامی اوپنی بریعت ایمانی معلوم ہوتا ہے، حقیقتاً اسلامی تعلیمات کے اسی قدر منافی اور سچی اسلامیت کی صندھ ہے۔

رسول اکرمؐ کا اسوہ حسنة ہمارے سامنے ہے۔ آنحضرتؐ نے حالات کے مطابق یہودیوں اور عزیز مسلم عرب قبائل سے باہم پُر امن رہنے، کسی طرف سے جاریت کی صورت میں ایک دوسرے کی امداد کرنے اور معاشرتی لین دین پر قرار رکھنے کے لئے معاہدے کئے۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ جب تک فریقیتی معاہدے کا پابند رہا، آنحضرتؐ نے اس کو حلیف جانا اور اس کے ساتھ ہر طرح کی مروٹ اور حسن اخلاق سے پیش کیے۔ اس سے کم از کم یہ تو شابت ہوتا ہے کہ مسلمان عزیز مسلموں کو رفاع، فروعِ امن اور معاشرتی لین دین کے لئے حلیف بن سکتے ہیں اور کسی قوم یا معاشرے کا عزیز مسلم ہونا بذاتِ خود یہ جواز ہمیا ہیں کرتا کہ مسلمانوں کو ان کے خلاف اذلی وابدی طور پر پرسپکیار ہونا چاہیے۔

قرآن حکیم میں علاوه معاہدوں کی سختی سے پابندی کے خواہ معاہدہ دوست سے ہو یادِ شمن سے، اہل کتاب سے ہو یا کفار سے، دو اصول عزیز مسلموں کے ساتھ برقرار کے اور بیان ہوئے ہیں جن میں سے ہمیں رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔

پہلا اصول یوں بیان ہوا ہے:

وَكَأَيْحَى مِنْكُمْ شَنَانٌ تَوْمَعَنَى إِلَّا لَعَنِ لُواطٍ أَعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ وَاللَّهُ أَكْبَرُ  
(رسورہ المائدۃ: ۸) — کسی قوم کی دشمنی تھیں اس امر پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو۔ وہ پرہیز گاری کے بہت نزدیک ہے اور اللہ سے ڈرو۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ انصاف وہ تعاون اور حکم ہے جو دشمنوں کے ضمن میں بھی طلب نہیں کیا اور جسے ضرور پورا ہونا چاہیے۔

دشمنوں کے ساتھ انصاف!

ذرا غور تو فرمائیے اس کی دلالتوں کا میدان کتنا وسیع اور عزیز محدود ہے۔ ظاہر ہے اس سے یہی مراد

منہیں کر اگر دشمن سے کوئی معاہدہ کرو تو اسے بخواہ۔ اس حکم اور غرض قرآنی کا یہ مطلب بھی ہے کہ اگر کسی شش قوم میں نیکی اور خیسرا اور اچھائی اور فلاح کی باتیں دیکھو تو ان کی قرار واقعی داد دو اور اس کا اعتراف کرو کیونکہ کسی الیسے گروہ کو جو سچ بولتا ہو، دوسروں کامال نہ کھائے، باہم ہمدردی اور اخوت کے جذبے کے ساتھ زندگی لبر کرے، اس کے متعلق خاص ان امور میں بُری رائے قائم کرنا یا اس کی اچھائیوں کو برایاں ظاہر کرنا الصاف کے ہر یجا علاف ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی قوم کا رخواہ وہ دوست ہو یا دشمن (ظرف تعلیم عمدہ ہے یا اس کے سیاسی اور معاشرتی ادارے اعلیٰ درجے کے ہیں یا اس کا معاشرتی نظام سب کی بھلائی اور بہبود پر استوار ہے) تو اس حکم قرآنی کی رو سے ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس حد تک اس قوم کی خوبیوں کا فراخدی کے ساتھ اعتراف کریں تاکہ انصافات کا لئاپن اپورا ہو، نہ یہ کہ محض یہ جان کر کہ وہ قوم کلمہ گو ہنہیں ہم اس کی ہربات کو ضلالت اور اس کی ہر خوبی کو گمراہی قرار دینے پر اڑ جائیں۔

دوسری حکم قرآنی جو اس صحن میں ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے، یہ ہے :-

وَلَعَلَّهُ وَنُوَا عَلَى الْبَرِّ وَالْتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَوَّنْ وَنُوَا عَلَى إِلَائِهِمْ وَالْعُدُوِّ وَلَا وَلَقَوَ اللَّهُ طَرِيقُ الْمَأْدَةِ (۲۷)

— اور سقبلائی اور پرمیزگاری کے کاموں میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ہرگز

تعاون نہ کرو۔

آپ نے دیکھا قرآن حکیم نے تعاون اور عدم تعاون کا ایک ابدی لا جھر عمل ہمارے سامنے رکھا ہے۔ اس کی رو سے ہمارے تعاون اور عدم تعاون کا اختصار فریقِ ثانی کے حسب شب اور شناخت پر ہنہیں بلکہ اس مقصد اور میدانِ کار پر ہے جس کی خاطر آپ کسی سے تعاون یا عدم تعاون کرنے والے ہیں بنیں، اچھائی، عام بہبود اور بہتری کی خاطر تعاون خواہ کسی سے ہو (مسلم سے ہو یا غیر مسلم سے، اپنے سے ہو یا بیگانوں سے) قرآن کی نظر میں مستحسن ہے اور برائی اور گناہ اور زیادتی کی غرض سے تعاون خواہ والدین ہی سے کیوں نہ ہو، ممنوع ہے۔ قرآن کی نظر میں غیر مستحسن اور قبیح ہے۔

اگر ہم ان صابطوں اور قرآنی اصولوں پر عمل پیرا ہوں اور ان کی معنویت کو سمجھنے کی عملائی کو شش کریں تو ہمارے ذہنوں کا بہت سا انتشار اور ہمارے دماغوں کی بہت سی تنگیاں اور تاریکیاں دُور ہو سکتی ہیں اور دنیا بھر کی باقی ثقافتیوں کی طرف جب ہم حق وال انصافات اور عدل و اعتراف کی نظروں سے دیکھیں گے تو مجھے لیقین ہے ہمارے بہت سے مسائل ہمارے لئے اتنے مشکل اور کھنڈن نہیں رہیں

گے، جتنے وہ اب ہیں۔

(۵)

## عَالِمُ اِسْلَامُ کا اتحاد

بظاہر یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ پاکستان میں اسلام کے استحکام کا عالم اسلامی کے اتحاد سے کیا لعلت ہے یا کم از کم اس کو ایک بنیادی شرط کے طور پر کیوں پیش کیا جا رہا ہے اس کا سبب یہی ابھی بیان کرتا ہوں دراصل بات یہ ہے کہ جب تک کوئی مشن یا لضب العین اپنی وسعتوں کے ساتھ نگاہوں کے سامنے نہ رہے اور اس کے حصوں کی ترتیب مسلسل دلوں کو گرامی اور جلاتی نہ رہے، وہ لضب العین اپنی محدود معقولیت بھی کھو سکتا ہے اور اس سے والبستہ افراد آہستہ آہستہ دلوں کے سرد اور ہمتوں کے پست ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم پاکستان میں اسلام کا استحکام چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم ان بنیادوں پر کام کریں جو دنیا بھر میں یا کم از کم اسلامی ملکوں میں اسلام کی حیثیت کو اس کی موجودہ حیثیت سے بہتر اور زیادہ مضبوط کر دے۔ اسلام کی سر بلندی اور نشانہ ثانی کی تحریکیں قریب ہر اسلامی ملک میں اٹھ رہی ہیں۔ ان میں بعض عناصر رجعت پسند اور ترقی کی راہ میں حائل بھی ہیں لیکن انہی تحریکیوں سے والبستہ کروڑوں افراد ایسے بھی ہیں جو اسلام سے سچی محبت اور جدید مسائل کا انہم دلوں رکھتے ہیں۔

آج کا دُور ملکوں اور ملکتوں کی حدود سے نکل کر ہم خیالوں اور ہم نظروں کے اکٹھے ہونے کا دور ہے۔ اشتراکی اور غیر اشتراکی ممالک اپنی اپنی قومیتوں سے باہر عقامہ و نظریات کا اشتراک ڈھونڈ رہے ہیں اور زندگی کی شکمش میں اس اشتراک کو اتحاد کارنگ دیگر مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جاتے ہیں۔ جس تکنیک کو اہل مغرب اور اہل مستشرق نے اب کہیں جا کر دریافت کیا ہے، اسلام اسے صدیوں پہلے برتوئے کا رلا یا تھا۔ قرون اولیٰ میں مسلمانوں کے فروع اور اسلام کے استحکام کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ مسلمانوں نے اپنے لضب العین تبلیغ اسلام اور اتحاد بین المسلمين۔ سب کو غیر محدود رکھا اور اسے قبیلوں، گروہوں اور ملکوں کی تنگ نائے میں گھرنے تھا دیا۔

دوسری وجہ یہی بیان کرنا چاہتا ہوں کہ عورت سے دیکھئے تو کم از کم علامہ اقبال کی حد تک تحریک پاکستان دراصل ایشیا میں اسلام کے فروع و استحکام کی طرف پہلا قدم تھا۔ آپ علامہ اقبال مرحوم کے دلوں سیاسی خطیبے — ال آباد کا مسلم لیگ کا خطیبے ۱۹۴۷ اور لاہور کا مسلم کانفرنس کا خطیبے ۱۹۴۸ اور قائد اعظم کے نام کے خطوط اور ان کے دیگر سیاسی بیانات دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ علامہ اقبال

بر صغیر کی تقسیم، بالخصوص شمال مغربی ہند میں ایک آزاد اسلامی حکومت کے قیام کو بر صغیر کے مسلمانوں کی سختگات کے علاوہ خود اسلام کے روشن مستقبل کے لئے بھی ناگزیر خیال کرتے تھے اور ان کے انکار اور نکر مذہبیوں کی تہمیں یہ دلوں آرزویں ساختہ ساختہ کار فرما تھیں۔ یہ اس لئے کہ وہ بر صغیر کے شمال مغرب میں مسلمانوں کے استحکام اور مشرق وسطیٰ میں اسلام کے فروع اور طاقت کو لازم و ملزم خیال کرتے تھے، رفتارِ زمانہ سے باخبر لوگ گواہی دیں گے کہ علامہ اقبال کی وفات کے بعد سے اب تک واقعات نے جو رنگ اختیار کیا ہے، اس سے علامہ مر حوم کے نکر و نظر کی صداقت اور اصابت اور عیال ہوتی ہے اور اگر پاکستان کے مسلمانوں نے اس جذبے اور مقصودیت کو کھو دیا جو اقبال کی بصیرت نے ان کو دیا تھا تو یہ کوتاہی خوران کے حق میں کوئی نیک فال ثابت نہ ہوگی۔ جیسا میں نے اوپر کہا ہے قوموں کی زندگی ان کے نصب العین کی وسعت پذیری اور اس کے لئے مسلسل جدوجہد کرنے میں ہے، اس سے نظریں چرانے یا اسے بھول جانے میں نہیں۔

عالم اسلامی کے اتحاد سے یہی مراد ہے کہ حکومتوں کی سطح پر آر۔ سی۔ ڈی (RCD) جیسے باہمی تعاون کے ادارے وجود میں لائے جائیں۔ یہ ادارے بھی ہمارے اتحاد کا منظہر ہے اور یہ حد مفید کام سرازیر ہے میں تاہم جس بات پر یہاں زور دیتا جا ستا ہوں، وہ عوام کا شعور اور اسلامی ملکوں کے اندر ایک صحیح منہج مصوبہ طریقے عالم کی تخلیق کا سوال ہے جو اپنے معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسائل کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل کرنے کی حامی اور علمبردار ہو۔

یہاں ایک خطرے سے آگاہ کر دیا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عالم اسلامی کے اتحاد کی مهمیں جس شعور درجہ بے کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس کا صحیح منہج متوازن اور مناسب خطوط پر فعال ہونا ضروری ہے۔ تحریک غلافت کے زمانے میں بر صغیر کے مسلمانوں نے اسلامی محبت و اتحاد کے نام پر بڑے جوش و خروش اور ایثار و قربانی کا ثبوت دیا تھا لیکن اس جوش و خروش میں توازن، صحیح منہج اور حقیقت پسند ہونا چاہیے تاکہ اس کے ذریعے اسلام کے صرف لغترے بلند نہ ہوں اور زور بیان سے مخفی جذبات میں گری اور تیزی پیدا نہ ہو بلکہ راہ کی مشکلات اور موانع پر نظر رکھتے ہوئے ہم آہستہ آہستہ منزل مقصود کی طرف ہو امام اور مصوبہ طریقہ میں سے آگے ٹرھنے کے قابل ہوں۔ اور ایک معقول مدت میں

ایسے ادارے (معاشری اور سیاسی) نام کر سکیں جنہیں میسوی صدی میں اسلامی تعلیمات کی عملی تغیرت ارادیا جائے سکے۔

مشرق وسطی میں اسرائیل کی حالتی جا رہیت ہمیں دو طرح سے متاثر کر سکتی ہے۔ ہمارے درمیان جو حضرات اسلام کے مستقبل سے مایوس اور عالم اسلام کے اتحاد سے بے تعلق ہیں، بلاشبہ ان کی مایوسی اور بے تعلقی میں اضافہ ہوا ہو گا لیکن جو لوگ اسلام کے مستقبل پر تین رکھتے ہیں اور عالم اسلام کے اتحاد کے لئے کام کرنے کے آرزو مند ہیں، ان کے لئے اسرائیل کی کامیابیوں اور عرب لوگوں کی ناکامی میں یہی سینق پوشیدہ اور عیاں ہے کہ جب تک ہم حقیقت پسندی سے کام لینا ہمیں سیکھیں گے اور جذبات کی تیزی اور لغفرہ بازی کی راہ ترک نہیں کریں گے، ہم اپنے ارادوں میں کامیاب اور اپنی آرزوؤں میں سفر و نہیں ہو سکتے۔

عالم اسلام کا اتحاد نہ سہل ہے اور نہ غیر ممکن۔ السنافی تاریخ کے تمام عظیم نسب العینوں کی طرح بلاشبہ مشکل اور کھلٹن ضرور ہے اور اپنے حصول کے لئے (آئین فطرت کے مطابق) کا ارادوں کی پیشگی تدبیر و فراست اور مسلسل جدوجہد کا لفاضا کرتا ہے۔

اور اسرائیل کی جا رہیت کا اشارہ اس طرف بھی تو ہے کہ اگر مسلمان اب بھی نہ سنبھلے اور انہوں نے حقائق بینی سے کام نہ لیا اور وہ متحد نہ ہوئے تو پھر شاہدِ کوئی اور موقع ان کو اس غرض کے لئے ہاتھ بینی آئے گا۔